رسائل و مسائل

پانچ نمازیں اور پچاس نمازیں

سوال : منکرین حدیث اُس حدیث معراج پر بہت سے تمسخر آمیز اعتراضات کرتے رہتے ہیں جس میں پہلے پچاس نمازوں اور پھر حضرت موسیٰؑ کے مشورے پر آخر کار پانچ نمازوں کے فرض کیے جانے کا ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے جب پچاس نمازیں فرض کیں تو کیا اُس وقت اُسے احساس نہ تھا کہ میں ایک ناممکن العمل حکم دے رہا ہوں۔ کیا حضرت موسیٰؑ کے مشورے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی درخواست ہی پر اللہ میاں کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ کیا حضرت موسیٰ اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی (نعوذ باللہ) بڑھ کر ہمہ داں ہیں کہ جو بات حضرت موسیٰؑ کو بروقت سوجھ گئی وہ اللہ اور اس کے آخری نبیؐ کے حاشیۂ خیال میں بروقت نہ آسکی۔ کیا دین کے محکم احکام اللہ میاں اسی طرح متعین کرتے ہیں کہ پچاس سے شروع کرتے ہیں اور چھوٹ دے کر پانچ پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ منکرین حدیث کے خیال میں یہ حدیث کسی یہودی نے گھڑی ہے تاکہ ان کے نبی کی فضیلت ثابت ہو۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ نمازیں اگر ابتداءً پچاس فرض کی بھی گئی تھیں تب بھی پانچ کی تعیین کے بعد پھر پچاس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس سے بلا وجہ ذہن میں الجھن پیدا نہیں ہوتی اور کیا اس طرح کی احادیث غیر مسلموں کو اعتراضات کے مواقع فراہم نہیں کرتیں ؟ لیکن مسلمان پھر بھی ان حدیثوں کو سینے سے چمٹائے پھر رہے ہیں۔

براہ کرم اس حدیث کی صحت پر روشنی ڈالیں اور اس کی تاویل و تشریح بھی کریں تاکہ منکرین حدیث کے اعتراضات رفع ہو جائیں۔

جواب : یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ اس حدیث سے مقصود یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ پانچ نمازیں تعداد کے

لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اس لیے پنج وقتہ نماز کو منکرین حدیث کی طرح وبالِ جان سمجھ کر اس کی تعداد اس کی ہیئت اور اس کے مفہوم و معانی میں کتر بیونت اور ترمیم و تنسیخ کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ اس حدیث سے مسلمانوں کو یہ تصور دلانا مطلوب ہے کہ یہ تعداد کم سے کم رکھی گئی ہے جو درحقیقت پچاس کی قائم مقام ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے ورنہ اگر پچاس نمازیں بھی فرض کردی جاتیں تو بے جا نہ ہوتا۔

اگر ہم طلبِ ہدایت کا جذبہ لیے ہوئے اس حدیث کا مطالعہ کریں تو اس سے ہمیں وہی تعلیم ملتی ہے جو ابھی بیان ہوئی ہے۔ لیکن اگر ہم اسے انکار 'استخفاف' اور استہزاء کی نیت سے دیکھیں تو اس حدیث کے پڑھنے سے وہ سارے اشکالات اور سوالات پیدا ہوتے ہیں جو آپ نے نقل کیے ہیں۔ اسی ایک حدیث پر کیا موقوف ہے اس کے علاوہ بے شمار دیگر احادیث بلکہ بے شمار آیات قرآنی پر اگر اسی طرح طبع آزمائی کی جائے تو ان پر اسی طرح کے بیسیوں اعتراضات وارد کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً جہاد کا حکم دیتے ہوئے سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ ایک جگہ فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ (الانفال ۶۵)

اے نبی ابھارو مومنین کو قتال پر۔ اگر ہوں گے تم میں سے بیس ثابت قدم، غالب ہوں گے دو سو پر اور اگر ہوں گے تم میں سے سو، غالب آئیں گے ہزار پر کافروں میں سے، کیونکہ وہ بے سمجھ لوگ ہیں۔

اب اس جگہ صاف طور پر کافروں کے بالمقابل مسلمانوں کے غالب ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں اور کافروں کی ایک اور دس کی نسبت بیان فرمائی ہے، لیکن اس کے فوراً بعد دوسری آیت ہے:

الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ

اب اللہ تعالیٰ نے تخفیف کردی تم پر سے اور جان لیا کہ تم میں کمزوری ہے، پس اگر ہوں گے تم میں سے سو ثابت قدم، غالب آئیں گے دو سو پر اور اگر ہوں گے تم میں سے ہزار، غالب آئیں گے دو ہزار پر اللہ کے

اذن سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یہاں دیکھ لیجیے کہ غلبے کے وقوع کے لیے نسبت کو ۱ : ۱۰ سے کم کر کے ۱ : ۲ کر دیا گیا ہے، اب اگر تھوڑی دیر کے لیے منکرین حدیث کی ذہنیت مستعار لے لی جائے تو ان آیات پر بھی اُسی طرح کے اعتراضات کیے جا سکتے ہیں جس طرح کے حدیثِ مذکور پر کیے گئے ہیں۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ اللہ میاں کو شروع کی آیات نازل کرتے وقت کیا ضعف معلوم نہ تھا کہ ایک اور دس کے تناسب کو خواہ مخواہ بیان کر دیا۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھوٹ ہو گئی اور نسبت کو ایک ہی سانس میں تبدیل کر دیا گیا تو پھر سابق نسبت کو بیان کر کے کیوں بلا وجہ ہمیں الجھن میں ڈالا گیا۔

اسی طرح سورۂ مزمل میں پہلے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا

اے اوڑھے لپیٹے شخص اُٹھ رات کو مگر تھوڑا، آدھا حصہ اُس کا یا اُس سے کم کر لے تھوڑا سا یا اُس پر اضافہ کر لے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔

پھر فرمایا:

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔

تیرا رب جانتا ہے کہ تو اُٹھتا ہے دو تہائی رات سے کچھ کم اور آدھی رات اور ایک تہائی رات اور ایک گروہ ان لوگوں میں سے جو تیرے ساتھ ہیں اور اللہ اندازہ کرتا ہے رات دن کا۔ جان لیا (اللہ نے) کہ تم اس پر قادر نہیں ہو سکو گے پس اُس نے رجوع کیا تمہاری طرف پس پڑھو جتنا آسان ہو قرآن میں سے جان لیا (اللہ نے) کہ ہوں گے تم میں سے بیمار اور کچھ دوسرے چلیں گے زمین میں تلاش کریں گے اللہ کے فضل میں سے اور دوسرے لڑیں گے اللہ کی

راہ میں پس پڑھو جتنا آسان ہو اُس میں سے ۔

یہاں بھی یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ احکام متعین کرنے کا یہ عجیب طریقہ ہے کہ پہلے تو نصف شب یا اُس کے کم و بیش کے قریب قیام لیل کا حکم دیا اور پھر یہ کہا گیا کہ اللہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم یہ حکم بجا نہیں لا سکو گے اور یہ بات بھی اُس کے علم میں آ گئی ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے کچھ مسافر ہوں گے اور کچھ قتال فی سبیل اللہ کریں گے ، اس لیے چلو اب ½ ، ⅓ یا ⅔ حصہ شب کی عبادت کی قید ختم کی جاتی ہے اور تمہیں چھوٹ دی جاتی ہے کہ بآسانی جتنا قرآن پڑھ سکو ، پڑھ لو ۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیا اللہ کو (نعوذ باللہ) بعد میں ہوش آیا کہ میں ایک ناممکن العمل حکم دے بیٹھا ہوں اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ کیا اب اُس کے نوٹس میں یہ بات آئی ہے کہ ہم میں سے تو مریض ، مسافر مقاتل بھی ہوں گے ، اس لیے قیام لیل کی سابق مقدارِ مطلوب کو ایک زیادتی سمجھ کر اب اُس میں تبدیلی کی جا رہی ہے ۔

اسی طرح مثلاً قرآن میں ایک جگہ یہ آیا ہے وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً اور دوسری جگہ آیا ہے وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ یعنی ایک جگہ یہ کہا گیا کہ ہم نے موسیٰؑ سے چالیس دن طے کیے تھے اور دوسری جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے تیس دن طے کیے تھے اور پھر دس سے ان کی تکمیل کی ۔ ایک مریض القلب آدمی یہاں بھی یہ اعتراض جڑ سکتا ہے کہ آخر یہ کیسا انداز بیان ہے کہ ایک جگہ میعاد صاف طور پر چالیس دن بتائی گئی اور دوسری جگہ تیس دن بتائی گئی اور پھر اس میں دس بڑھا کر چالیس کی گنتی پوری کرنے کا تکلف کیا گیا ۔

ان دو تین مثالوں سے بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر نکتہ چینی اور نکتہ آفرینی کا شوق ہو تو حدیث تو درکنار قرآن کی ایک ایک آیت کے بارے میں اعتراضات کے انبار لگائے جا سکتے ہیں لیکن اگر آدمی نصیحت و عبرت اور ہدایت و تذکیر کا طالب ہو تو وہ ابتغائے فتنہ کا مشغلہ نہیں اختیار کرتا بلکہ اتباعِ احسن کی روش پر کاربند ہوتا ہے ۔ جو حدیث اس وقت معرض بحث میں ہے اُس کے بارے میں بھی ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو اختیار کیا جا سکتا ہے ۔ ایک نکتہ لگاہ سے اس حدیث کو دیکھنے والا

پانچ اور پچاس ہی کی گنتی میں اُلجھ کر رہ جائے گا یا پھر اس طرح کی کج بحثیوں میں مبتلا ہو جائے گا کہ مشورہ دینے والے نبی، مشورہ لینے والے نبی اور مشورہ قبول کرنے والے خدا، ان تینوں میں سے زیادہ صاحب علم، معاملہ فہم اور حاضر دماغ کون ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر سے اگر اس حدیث پر غور کیا جائے تو انسان کو اس کے اندر دین کے ایک عظیم اصول یعنی اصولِ تخفیف و تیسیر کی ایک دلآویز تصویر نظر آتی ہے۔ اس میں ایک طرف تو اس حقیقت کا تصور دلایا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں یہ حکم دے کہ ہم دن رات میں پچاس مرتبہ اس کی اطاعت کا عہد استوار کریں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں تو یہ ہرگز اللہ کی طرف سے "زیادتی" نہ ہوگی اور اُس نے اپنے دو محبوب رسولوں کی درخواست اور سفارش پر اگر صرف پانچ مرتبہ ایسا کرنے کا حکم دیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب کوئی نئی حقیقت اُس کے سامنے منکشف ہوئی ہے جس کا اُسے پہلے "علم و احساس" نہ تھا۔ نہیں! ہرگز نہیں!! بلکہ اس طرح وہ اپنے فضل و انعام اور اپنی رحمت و مودّت کا احساس اپنے بندوں کو دلانا چاہتا ہے اور اس تخفیف کا ذریعہ اُس نے اپنے دو پیغمبروں کو اس لیے بنایا ہے تاکہ ان کی تکریم و تشریف ہو، ہمارے دلوں میں ان کی محبت جاگزیں ہو اور اللہ کے ہاں اُس کے انبیاء کی جو قدر و منزلت ہے ہمیں اس کا اندازہ ہو۔ جب ہم اس نگاہ سے اس حدیث پر غور کرتے ہیں تو ہمارا دل اعتراض کے کانٹوں سے پاک اور اللہ کی حمد و ثنا سے لبریز ہو جاتا ہے۔

اس حدیث کے ضمن میں حضرت موسیٰ کی افضلیت اور کسی یہودی کے اس حدیث کو گھڑنے کا سوال بھی وہی شخص پیدا کر سکتا ہے جو خواہ مخواہ کی کور ذوقی، کج فہمی اور شقاق میں مبتلا ہو۔ قرآن و حدیث دونوں میں یہ حقیقت واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ خدا کے رسول ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں۔ کسی کی شخصیت میں ایک وصف نمایاں ہے تو کسی دوسرے رسول میں کوئی اور خصوصیت نمایاں ہے۔ ہم ان کے انفرادی خصائص بیان کر سکتے ہیں مگر ہمارا بیان ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے کسی خاص نبی کی توہین و تحقیر کا پہلو نکلتا ہو۔ زیر بحث حدیث بھی انبیاء کے توہین آمیز تقابل یا تفاضل سے بالکل پاک ہے۔ اگر منکرین حدیث کے حسنِ استدلال کی داد دیتے ہوئے ہم یہ تسلیم کر لیں کہ مشورہ دینے والے کی افضلیت اور اس کے

علم و فہم کی برتری مشورہ قبول کرنے والے کے بالمقابل اسی طرح سے ثابت ہو جاتی ہے جس طرح یہ سخن شناس اس حدیث سے ثابت کر رہے ہیں تب تو خود خدا کے مقابلے میں (نعوذ باللہ) حضرت موسیٰ کی افضلیت قرآن ہی سے ثابت کی جا سکتی ہے۔ قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون اور اس کی قوم کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کا حکم دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا کہ میں زبان آور نہیں ہوں اور ڈرتا ہوں کہ جھٹلا نہ دیا جاؤں اس لیے آپ ہارونؑ کو میرا وزیر اور شریک بنا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو تسلیم فرمایا اور حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ کا شریک کار بنا دیا۔ کیا اس واقعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ (العیاذ باللہ) خدا سے بھی اعلم و افضل ہیں کہ خدا کو تو اس کا احساس نہ ہوا کہ اس کام کے لیے موسیٰؑ تنہا کافی نہیں، اور اگر اس کا احساس ہوا تو حضرت موسیٰ ہی کو ہوا اور ان کے کہنے پر اللہ تعالیٰ کی سمجھ میں بھی آیا کہ بات تو واقعی ٹھیک ہے اور اکیلے موسیٰؑ پر یہ بوجھ لاد دینا زیادتی ہے"۔ کیا اللہ تعالیٰ ایسے "شہِ بے خبر" ہیں کہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ فلاں کام کے لیے کیسے اور کتنے کارکن درکار ہیں جس طرح منکرینِ حدیث یہ سوال کرتے ہیں کہ "کیا نماز جیسے محکم احکام اس طرح باہمی مشاورت سے متعین ہوتے تھے"۔ اسی طرح کیا یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ "آیا منصب نبوت جیسے بارِ عظم کے لیے مردانِ کار کا انتخاب اس طرح کے اتفاقی مشوروں کی روشنی میں کیا جاتا ہے"؟ کیا وہ قرآنی آیات جن میں اللہ میاں اور حضرت موسیٰؑ کی گفت و شنید مذکور ہے کیا وہ بھی کسی یہودی کی تصنیف ہیں؟

آخر میں اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معراج سے متعلق جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں خواہ وہ قرآن میں ہوں یا حدیث میں ان کا بڑا حصہ متشابہات کی قبیل سے ہے۔ اس لیے مجملاً انہیں تسلیم کر لینے اور ان کے عبرت و نصیحت کے پہلوؤں پر اپنی نگاہیں جمائے رکھنے کے بجائے اگر مین میخ اور کھوج کرید کا سلسلہ شروع کر دیا جائے تو سوائے گمراہی اور بے راہ روی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف آسمانوں پر لے جایا گیا، اچھے اور برے انسانی اعمال کو پسندیدہ و ناپسندیدہ اشکال و واقعات کی شکل میں متمثل کر کے دکھایا گیا۔ جنت و دوزخ اور

ثواب و عذاب کا مشاہدہ کرایا گیا۔ سابقہ انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں۔ خود اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہِ الٰہی میں خصوصی بار یابی اور بار بار کی بار یابی سے مشرف فرمایا گیا۔ اب ایک شخص کی کھوپری اگر الٹی ہو تو وہ ان تفصیلات کی ہر شق پر بیسیوں اعتراضات کر سکتا ہے۔ چنانچہ منکرینِ حدیث ان احادیث کو اکثر نشانۂ تضحیک بنائے رکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ان احادیث سے قطع نظر کر کے اگر ہم واقعۂ معراج سے متعلق قرآنی آیات کو دیکھیں تو کیا ان آیات میں بھی ایسا "تشابہ" موجود نہیں ہے جس کی صحیح تاویل کو اللہ ہی کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ کیا قرآن میں "اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جانے اور اپنی آیات دکھانے" کا ذکر نہیں ہے؟ کیا قرآن میں کسی کے "دو کمان یا اس سے قریب تر ہونے" کا ذکر نہیں ہے؟ کیا سوال کرنے والا یہاں یہ سوال نہیں کر سکتا کہ دو کمان سے کیا مراد ہے اور اگر فاصلہ دو ہی کمان تھا تو پھر اَوْ اَدْنٰی کہنے کا کیا قرینہ تھا۔ پھر قرآن میں جس "سدرۃ المنتہیٰ" کا ذکر ہے اس کے بارے میں بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا یہ وہی سِدرہ (بیری) کا معروف درخت ہے اور اگر وہی ہے تو پھر "پرلی بیری" سے کیا مراد ہے؟ پھر وہ کیا چیز ہے جس نے اس بیری کو ڈھانپ رکھا تھا؟ کیا ان چیزوں پر غیر مسلموں کو اعتراض کرنے کا موقع پہلے یا آج کبھی نہیں ملا؟ پھر کیا وجہ ہے کہ منکرینِ حدیث ان آیات کو اپنے سینوں سے چمٹائے پھر رہے ہیں؟ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ قرآن پر براہِ راست حملہ کرنے کے لیے چونکہ ابھی فضا پوری طرح سازگار نہیں ہے اس لیے سرِدست پہلا مورچہ حدیث کے بالمقابل جمایا جا رہا ہے؟